© rasailojaraid.com

مختلف دفعات کے ماتحت ترتیب اور ایک خاص نظم ونسق کے ساتھ بیان کردیے جاتے ہیں بلکہ اُس کی مثال اُس طبیب حاذق کی سی ہے جو مریض کے لمحہ بہ لمحہ متغیر ہونے والے احوال کو دیکھ کر نسخہ میں ترمیم وتنسیخ کرتا رہتا ہے اور یا وہ فوج کے اُس قائد کی طرح ہے جو طریق جنگ کی مصلحتوں اور فریق مخالف کی مورچہ بندیوں، اور اصول اقدام وتاخر کے پیش نظر کبھی فوج کو کسی محاذ پر لڑنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اور کبھی کسی دوسرے محاذ پر جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے کبھی وہ تلوار استعمال کراتا ہے اور کبھی بندوق یا توپ۔ کبھی وہ آگے بڑھنے کا حکم دیتا ہے اور کبھی فوج کو مصلحتاً پیچھے ہٹاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب احکام اپنی اپنی جگہ نہایت ضروری اور واجب العمل ہیں سطحی طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک حکم دوسرے حکم کے منافی ہے، یا ایک نسخہ دوسرے نسخہ کی ضد ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ باہمی تضاد ومنافات کے باوجود ان میں کا ہر ایک حکم اور نسخہ اپنے مخصوص موقع ومحل کے اعتبار سے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ دوسرا اپنا موقع ومحل پر۔ اگر ایک کو دوسرے کی جگہ پر رکھ دیا جائے تو اُس کا نتیجہ بجز تباہی وبربادی کے اور کیا ہوسکتا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ جو دین دنیا میں آخری دین بن کر آیا ہو اُس میں ایسی لچک اور تنوع احکام ہونا ضروری ہے۔

انسان کی تمام انفرادی واجتماعی ضرورتوں پر شامل ہونے کی یہی وہ صفتِ قرآن ہے جس کو حکمت سے تعبیر فرمایا گیا ہے:۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الحكيم۔ — یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں

ایک جگہ ارشاد ہے:۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوحىٰ اليك ربُّكَ من الحكمة — یہ اُس حکمت میں سے ہے جو آپ کے پروردگار نے آپ پر نازل کی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذٰلک نتلوہٗ علیک من الاٰیٰت	یہ وہ آیتیں اور حکمت والا ذکر ہے جو ہم تم پر
والذّکر الحکیم۔	پڑھتے ہیں۔

قرآنِ مجید کی صفتِ جامعیت کو ایک دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا گیا۔

ونزّلنا علیک الکتٰب تبیاناً لکلّ	اور ہم نے آپ پر قرآن مجید نازل کیا جو ہر چیز
شیءٍ وّھدًی ورحمۃً وّبشرٰی	کو کھول کر بیان کرتا ہے اور جو مسلمانوں کے
للمسلمین۔	لیے ہدایت، رحمت اور بشارت ہے

لیکن جن لوگوں کی طبیعت میں کجی ہوتی ہے وہ اس تنوع احکام کو برداشت نہیں کرسکتے اُن کی قوت فکر مختلف احکام کو اپنی اپنی جگہ پر رکھنے سے قاصر ہوتی ہے تو وہ کسی ایک طرف جھک جاتے ہیں، اور اپنی طرف سے کسی ایک قطعی حکم کا یقین کرلیتے ہیں۔ اسی قسم کے لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

افتومنون ببعض الکتٰب وتکفرون	کیا تم قرآن مجید کے بعض حصوں پر ایمان لاتے
ببعض، فما جزاء من یفعل ذٰلک	ہو اور بعض سے کفر کرتے ہو۔ تو کیا نہیں ہے
منکم الّا خزی فی الحیٰوۃ الدنیا	اُس شخص کی جزا جو تم میں سے ایسا کرتا ہے
ویوم القیٰمۃ یردون الٰی اشدّ	مگر دنیا کی زندگی میں ذلیل ہونا اور قیامت کے
العذاب وما اللّٰہ بغافل عمّا	دن وہ لوگ شدید ترین عذاب میں مبتلا کیے
تعملون۔	جائینگے۔ اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

نکتہ یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں رسوا ہونے کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ اسکی وجہ وہی ہے جو ہم نے ابھی ذکر کی یعنی یہ کہ لوگ جب قرآن مجید کے مختلف احکام میں باہمی توازن وتناسب کو قائم نہیں رکھ سکینگے اور کسی ایک جہت کی طرف مائل وراغب ہوکر ایک ہی حکم کو معمول بہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنائیں گے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے کیا ہوگا کہ انسانی واجتماعی ضرورتوں کے دوسرے گوشے تشنۂ تکمیل رہ جائیں۔ اور وہ اس بنا پر دنیوی تباہ حالی کے قعر عظیم میں جا پڑیں، جو مریض طبیب حاذق کی تجویز کے مطابق نو بہ نو نسخوں کو استعمال نہیں کرتا اور صرف ایک ہی نسخہ کے استعمال پر جمود کرکے بیٹھ جاتا ہے اُس کی اُمید شفا معلوم!

ناسخ ومنسوخ احکام کے ظاہری تعارض کو دیکھ کر بعض مفسرین آیات قرانی میں ناسخ ومنسوخ کے قائل ہو گئے ہیں اور اس کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ بعض علماء نے اس موضوع پر بھی مستقل کتابیں تصنیف کر ڈالی ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں " خاص اس موضوع پر اتنے لوگوں نے تصنیفات کی ہیں جن کا شمار نہیں ہو سکتا[1]" پھر ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت علی نے کسی قاضی سے پوچھا "تم ناسخ ومنسوخ کو جانتے ہو؟" اُس نے کہا "نہیں" آپ نے فرمایا "تم خود بھی ہلاک ہو گئے اور دوسروں کو بھی ہلاک کرو گے" ہماری رائے میں اگر یہ مقولہ درست ہے تو اس سے مراد نسخ کے اصطلاحی معنیٰ نہیں ہیں بلکہ موارد احکام مراد ہیں۔

لیکن اگر ناسخ ومنسوخ کی معنوی تنقیح کیجائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مفسرین نے اگر کسی آیت پر ناسخ ومنسوخ کا اطلاق کیا ہے تو محض مجازاً کیا ہے۔ ورنہ دراصل کوئی آیت عام اصطلاحی معنی کے اعتبار سے منسوخ نہیں ہے۔ "نسخ" کے معنی حقیقی ہیں زائل کر دینا اس بنا پر ایک آیت دوسری آیت کے لیے صحیح معنی میں ناسخ اُس وقت ہو سکتی ہے جبکہ منسوخ آیت پر عمل کرنا مطلقاً ناجائز قرار دیدیا جائے، حالانکہ قرآن کی کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جس پر مطلقاً عمل کرنا ناجائز ہو۔ مثلاً قرآن مجید میں ایک جگہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ انہیں کفار کے ہاتھوں سے جو اذیت پہنچے اُس پر صبر کرنا چاہیے۔ مگر دوسرے مواقع پر نہایت پُرزور طریقہ پر جہاد کی ترغیب دی گئی ہے

[1] الاتقان۔ جلد ۲ ص ۲۰۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چنانچہ ارشاد ہوا۔

یٰایّھا النبی جاھد الکفار و المنٰفقین واغلظ علیھم۔ — اے نبی آپ کفار و منافقین کے ساتھ جہاد کیجیے اور اُن پر سخت ہو جائیے۔

یٰایّھا الذین اٰمنوا قاتلوا الذین یلونکم من الکفار ولیجدوا فیکم غلظۃً — اے مومنو تم اُن کفار سے جنگ کرو جو تم سے قریب ہیں اور چاہیے کہ وہ تم میں سختی محسوس کریں۔

مفسرین نے آیت صبر علی الایذا، اور آیات جہاد میں تعارض دیکھ کر آیات جہاد کو آیت صبر کے لیے ناسخ کہا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ حقیقتاً نسخ ہے؟۔ صبر کرنے کا حکم اُس زمانہ میں تھا جبکہ مسلمان کمزور تھے، اور وہ کفار کو جواب ترکی بہ ترکی نہیں دے سکتے تھے۔ مگر جب خدا نے اُن کو طاقت و قوت عطا فرمادی، اور وہ جنگ کے قابل ہو گئے، تو اُنہیں جہاد کا حکم دے دیا گیا۔ اس بنا پر ان دونوں آیتوں کے ملا دینے سے دو حکم ثابت ہوتے ہیں:۔

(۱) اگر مسلمان کمزور ہوں تو اُنہیں کفار کے مصائب پر صبر کرنا چاہیے اور اندرونی طور پر کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ قوی ہو جائیں۔

(۲) پھر جب مسلمان قوی ہو جائیں تو اُنہیں جہاد کرنا چاہیے۔ اب خاموش بیٹھا رہنا اور کافروں کے مصائب برداشت کرتے رہنا اُن کے لیے ناجائز ہے۔

غور کیجیے جب دونوں آیتوں سے مختلف حالات کے مناسب دو مختلف احکام مستنبط ہوتے ہیں تو اب اُن میں سے کسی ایک کو دوسرے کے لیے ناسخ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کسی ایک حکم کو دوسرے حکم کے اعتبار سے منسوخ زمانی یعنی ہنگامی طور پر منسوخ کہہ سکتے ہیں جس طرح طبیب ایک نسخہ کو ملتوی کرا کے دوسرا نسخہ لکھتا ہے تو اُس کے معنیٰ یہ نہیں ہوتے کہ اب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہلے نسخہ کا استعمال سراسر ممنوع قرار دے دیا گیا ہے، اور وہ کسی حالت میں بھی قابل استعمال نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اُس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اب مریض کی موجودہ حالت کے پیش نظر اُس کو یہ نسخہ استعمال نہیں کرنا چاہیے، لیکن اگر اُس کی حالتِ اولیٰ عود کر آئے تو ظاہر ہے کہ اُس کو پھر وہ پہلا ہی نسخہ استعمال کرایا جائیگا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ "سورۃ الکافرون" کی آیت لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ (تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے) منسوخ التلاوۃ نہیں، منسوخ الحکم ہے لیکن اگر ذرا غور کیجیے تو اس کو منسوخ کہنا ہی درست نہیں ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہو کہ کافروں کو اپنے دین پر قائم رہنے پر رضامندی کا اظہار کیا جا رہا ہے جو اس کو منسوخ الحکم قرار دیا جائے بلکہ صورت یہ ہے کہ توحید کا داعیِ برحق کافروں کو اسلام کی دعوت دیتا ہے اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ بار بار دیتا ہے یہ لوگ اس دعوت کو سُن کر صرف اسی قبول کرنے سے انکار ہی نہیں کرتے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں، اور گستاخانہ برتاؤ برتتے ہیں اور اُلٹا خود آپ کو اپنا مذہب اختیار کر لینے کی دعوت دیتے ہیں اس پر آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اُن سے صاف صاف کہہ دیجیے کہ اگر تم دعوتِ اسلام قبول نہیں کرتے ہو مت کرو۔ میں بہرحال تمہارے بتوں کی پرستش نہیں کر سکتا۔ تم جانو تمہارا کام، "تم کو تمہارا مذہب مبارک ہو اور مجھ کو میرا دین" اب اس تقریر کو ذہن میں رکھ کر پوری سورت پڑھ جائیے اور بتائیے کہ کیا کسی ایک لفظ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار کو اپنے دین پر قائم رہنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اس سورت میں جو کچھ فرمایا گیا ہی اُس کا حاصل اس مضمون سے زیادہ نہیں جو من شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر یا لنا اعمالنا ولکم اعمالکم میں بیان فرمایا گیا ہے بس اس سورت کی کسی آیت پر عام اصطلاحی معنیٰ کے اعتبار سے نسخ کا اطلاق صحیح ہو ہی نہیں سکتا۔

علامہ محمود آلوسی نے اسی سورت کی اخیر آیت میں کئی احتمالات بیان کیے ہیں۔ پہلے احتمال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی بنا پر تو اُنھوں نے صاف کہا ہے

والاٰیۃ علی ماذکرہ محکمۃ غیر منسوخۃ اس احتمال پر آیت محکم غیر منسوخ ہے۔

دوسرا احتمال اُنھوں نے وہی بیان کیا ہے جو ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اور اس کے متعلق بھی آگے چل کر فرماتے ہیں وعلیہ لانسخ ایضاً اور اس احتمال پر بھی نسخ نہیں ہے۔

اِس گفتگو سے مقصد یہ ہے کہ اگر اسی طرح تمام اُن آیات میں غور کیا جائے جن کے متعلق نسخ کا ادعا کیا گیا ہے، تو یہ حقیقت صاف روشن ہو جائیگی کہ قرآن مجید کی کوئی ایک آیت کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ یا تو لوگوں نے آیت کے کسی لفظ سے کوئی خاص معنیٰ مُراد لے کر کوئی حکم خاص استنباط کر لیا ہے اور اُس حکم کو چونکہ منسوخ قرار دے دیا گیا ہے اس لیے اُنھوں نے خیال کیا کہ آیت ہی سرے سے منسوخ ہو گئی ہے، مثلاً قرآن مجید میں ہے:۔

فما استمتعتم بہ منھنّ فاٰتوھنّ اجورھنّ فریضۃً پس تم نے جن عورتوں سے تمتع کیا ہے تم اُن کو اُن کے مقررہ مہر دے دو۔

اس آیت کا لفظ "استمتعتم" سے بعض لوگوں نے نکاح متعہ مُراد لیا اور اس کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اس لیے اُنھوں نے کہا کہ یہ آیت بھی منسوخ الحکم ہے۔ حالانکہ "استمتعتم" سے مراد لطف اندوز ہونا ہے۔ متعہ سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی آیت میں کوئی حکم عام بیان کیا جاتا ہے اور اُس کے بعد کوئی دوسری آیت آئی ہے جس میں حکم کی کسی خاص موقع ومحل کے اعتبار سے تخصیص کر دی جاتی ہے بعض حضرات اس تخصیص پر بھی نسخ کا اطلاق کر دیتے ہیں۔ مثلاً عدت کے متعلق ایک آیت ہے:۔

والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً وصیۃً لازواجھم متاعاً اور وہ لوگ جو تم میں سے مرجائیں اور بیویاں چھوڑیں اُن پر اپنی بیویوں کے لیے وصیت کرنا ہے کہ سال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الی الحولِ غیر اخراجٍ	بھر تک اُن کو فائدہ دیں۔ گھر سے نہ نکالیں۔

اس سے بظاہر ثابت ہوتا ہے کہ عدت وفات ایک برس ہے۔ ایک دوسری آیت ہے:۔

والذین یتوفون منکم ویذرون	اور تم میں سے جو مر جائیں اور بیویاں چھوڑیں
ازواجاً یتربصن بانفسھن اربعۃ	تو وہ بیویاں اپنے آپ کو چار مہینے دس دن تک
اشھرٍ وعشراً فاذا بلغن اجلھنّ	(بطور عدت) روکے رکھیں، پھر جب وہ اس
فلا جناح علیکم فیما فعلن فی	مدت کو پورا کرلیں تو وہ جو کار خیر ہو کریں اُن
انفسھنّ بالمعروف۔	پر کوئی الزام نہیں ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ عدت وفات ایک سال نہیں بلکہ چار ماہ دس دن ہے۔ اب ان دونوں میں تعارض دیکھ کر بعض ارباب تفسیر نسخ کے قائل ہو گئے ہیں۔ حالانکہ اگر ذرا تعمق سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نسخ یہاں بھی نہیں ہے۔ پہلی آیت میں شوہروں کو حکم کیا جارہا ہے کہ وہ وفات کے وقت اپنے ورثہ کو اس بات کی وصیت کر جائیں کہ اگر اُن کی بیویاں سال بھر تک گھر میں رہنا چاہیں تو اُنہیں رہنے دیا جائے۔ اس مدت میں وہ اپنے اعزا و اقربا سے مشورہ کر کے اپنے لیے کوئی اچھا انتظام کرینگی۔ اخلاقی اعتبار سے یہ بات کس قدر بُری ہے کہ ایک عورت جو اپنے شوہر کی رفیقہ حیات بن کر عرصۂ دراز تک ایک گھر میں ساتھ رہی ہے، شوہر کی وفات کے بعد اُس کے ساتھ ایسی بیگانگت کا معاملہ کیا جائے کہ غریب کو اُس گھر میں ایک سال تک بھی قیام کرنے کی اجازت نہ دیجائے، اب رہا یہ امر کہ عورت کب تک عدت میں بیٹھے، اور وہ کب تک کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح نہیں کرسکتی، تو اس کے متعلق دوسری آیت میں صاف طور پر بتا دیا گیا کہ عورت کی مدتِ عدت چار ماہ دس دن ہے (اگر وہ حاملہ نہیں ہے) اب غور فرمائیے۔ ان دونوں میں کیا تعارض ہے جس کی وجہ سے نسخ کا قائل ہونے کی ضرورت ہو۔ چنانچہ حضرت مجاہد بن جبیر جو مشہور مفسر ہیں ان میں نسخ کے قائل نہیں تھے۔[1]

[1] بخاری کتاب التفسیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نسخ کے معنیٰ اگر ازالۂ حکم کے ہیں یعنی کسی آیت کو کسی آیت کے لیے ناسخ کہنے سے مُراد یہ ہوتی ہے کہ منسوخ آیت کا حکم بالکل زائل ہوچکا۔ اور اب اس پر عمل کرنا قطعی طور پر ممنوع قرار دے دیا گیا ہے تو جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اس معنی کے اعتبار سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہے اور اگر بر سبیل مجاز تخصیص عام، یا تعیینِ مدت، یا تفصیل اجمال پر نسخ کا اطلاق کیا جاسکتا ہے تو ہمیں اس کے لیے تسلیم کرنے میں عذر نہیں کہ اس معنی کے لحاظ سے نسخ کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ اور غالب یہ ہے کہ علماءِ اسلام جو نسخ بولتے ہیں اُس سے وہ دوسرے معنیٰ ہی مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ علامہ ابوبکر جصاص فرماتے ہیں "نسخ کے معنیٰ لغت میں خواہ کچھ ہی ہوں بہرحال شرع میں اس کے معنیٰ حکم یا تلاوت کی مدت کے بیان کردینے کے ہیں، پھر آگے چل کر بعض متاخرین کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"تم جانتے ہو قرآن مجید میں عام بھی ہے اور خاص بھی، محکم بھی ہے اور متشابہ بھی۔ پس وہ شخص جو قرآن میں نسخ کے وجود کا قائل نہیں ہے۔ گویا وہ قرآن میں عام وخاص اور محکم و متشابہ کو ہی نہیں مانتا۔ کیونکہ اس کے قول کے مطابق تو یہ لازم آتا ہے کہ تمام آیات کا ورود ایک ہی شان کا ہو[1]۔

اس تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کی بعض آیات پر جب نسخ کا اطلاق کیا جاتا ہے تو اُس سے مُراد ازالہ نہیں ہوتا بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ فلاں آیت میں جو حکم بیان کیا گیا تھا وہ فلاں وقت اور اُس زمانہ کے مخصوص حالات کے اعتبار سے تھا۔ اب جبکہ حالات دوسرے ہیں اُن کے لیے حکم یہ ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ فلاں قسم کے احوال کے لیے فلاں حکم ہے۔ اور فلاں قسم کے احوال کے لیے فلاں حکم۔ اس سے کسی ایک حکم کا مطلقاً ممنوع ہوجانا لازم نہیں آتا، بلکہ یہ تفصیل وتشریح تو عین کمال دین کی دلیل ہے۔

اصل یہ ہے کہ تمام بحثیں ہوتی رہیں۔ مگر کبھی نسخ کے معنیٰ اور اُس کی مُراد کی تنقیح کماحقہٗ نہیں کی گئی

[1] احکام القرآن ج ۱ ص ۹۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہی وجہ ہے کہ جن بزرگوں نے نسخ کو مانا ہے وہ خود آیاتِ منسوخہ کی تعداد میں بیحد مختلف ہیں پہلے عوام میں مشہور تھا کہ قرآن مجید میں پانسو یا تین سو آیات منسوخ ہیں، کسی نے کہا کہ صرف پچیس آیات منسوخ ہیں حضرت ابن عباس سے بعض لوگوں نے روایت کی کہ بیس آیات منسوخ ہیں، جن کو علامہ جلال الدین سیوطی نے نظم بھی کر دیا ہے۔ پھر حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا عہد میمنت مہد آیا تو آپ نے عمیق جستجو اور تحقیق و تفحص سے کام لے کر بتایا کہ صرف پانچ آیات منسوخ ہیں۔ آپ کے بعد مفتی محمد عبدہ المصری نے لکھا کہ ایک آیت بھی منسوخ نہیں ہے۔

ہم سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ نسخ کے اصل مفہوم کی جتنی تنقیح ہوتی رہی، آیاتِ منسوخہ میں بھی اُسی کے مطابق کمی واقع ہوتی رہی، یہاں تک کہ یہ حقیقت خودبخود واضح ہوگئی کہ دراصل قرآن مجید میں ایک آیت بھی منسوخ نہیں ہے۔

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ　آپ فرمائینگے اگر ایسا ہی ہے تو قرآن مجید کی آیت

ما ننسخ من اٰیۃٍ او ننسھا　　ہم کسی آیت کو منسوخ کرتے یا بھلا دینے میں

نأتِ بخیرٍ منھا او مثلھا.　　تو اس سے بہتر ایک آیت لاتے ہیں۔

کا کیا مطلب ہے؟ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی آیات میں نسخ موجود ہے۔ اس شبہ کے جواب کئی ہو سکتے ہیں، یہاں صرف دو کا ذکر کر دینا کافی ہوگا۔ پہلا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اٰیۃ کا لفظ مطلق ہے۔ اس سے صرف قرآن مجید کا حکم یا قرآن مجید کی کوئی آیت ہی مُراد لینا صحیح نہیں ہے اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہاں آیت سے مُراد وہ احکام ہیں جو اسلام سے قبل دوسرے ادیان و شرائع کے موجود تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اُن کو منسوخ کر کے دوسرے احکام بیان کیے جائیں، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بلکہ یہ احکام بہ نسبت احکامِ سابقہ کے بہتر ہونگے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اچھا مان لیا آیۃ سے مُراد آیتِ قرآن ہی ہے، لیکن نسخ کے معنی حکم کو بالکل زائل کر دینے کے نہیں ہیں بلکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تبدیل حکم کے معنیٰ ہیں جیسا کہ اس کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے۔

واذا بدلنا آیۃ مکان آیۃ واللہ	اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت
اعلم بما ینزل قالوا انما انت	رکھتے ہیں اور اللہ جس چیز کو نازل کرتا ہے اُس
مفتر۔	کو بہتر جاننے والا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں آپ تو افترا
	باندھنے والے ہیں۔

اس تبدیل آیت بالآیت کا مفہوم کیا ہے؟ یہ کہ ایک زمانہ میں کسی حکم خاص کے لیے کوئی آیت نازل ہوئی پھر جب حالات بدل گئے تو دوسری آیت نازل ہوئی اور اُس میں حکم جدید کا امر فرمایا گیا۔ اس کا مآل یہ ہوا کہ دو مختلف حالات کے اعتبار سے دو مختلف احکام نازل ہوئے اور دونوں اپنی اپنی جگہ برحق اور درست ہیں مسلمان کمزور تھے کافروں اور مشرکوں کی مقاومت نہیں کرسکتے تھے تو صبر کا حکم نازل ہوا، پھر جب وہ قوی ہو گئے تو انہیں جہاد کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ یہ دو حکم ہیں جو جس طرح پہلے درست تھے اب بھی ہیں جس طرح قابلِ عمل پہلے زمانہ میں تھے اب بھی ہیں۔ تبدیل آیت بالآیت کی حقیقت یہ ہے، اور بس۔ کفار و مشرکین اس تنوع احکام کو برداشت نہیں کرسکتے، طعن و تشنیع کرنے بیٹھ جاتے ہیں، اور کہنے لگتے ہیں کہ آپ کبھی کوئی حکم دیتے ہیں اور کبھی کوئی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی مصلحتوں کو بہتر جانتا ہے، اُسے معلوم ہے کہ کب اور کس وقت کونسا حکم ہونا چاہیے، اور کس وقت کونسا۔ پس دوسرے جواب کا لب لباب یہ ہے کہ آیت بالا میں جو حقیقت بیان فرمائی گئی ہے وہی ما ننسخ والی آیت میں بھی بیان کی گئی ہے، اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید میں نسخ بمعنیٰ ازالۂ حکم مطلقاً پایا جاتا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر کے ماتحت جو تقریر کی ہے اُس سے بھی اس کی ہی تائید ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:-

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاننا چاہیے کہ احکام شرعیہ میں نسخ کا حال احکام تکوینی میں نسخ جیسا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام احکام الٰہیہ خواہ شرعی ہوں یا تکوینی لوح محفوظ میں موجود اور ثابت ہیں اور اُن کی دو قسمیں ہیں۔ احکام خاص، احکام عام۔ پھر جو احکام خاص ہیں اُن کی دو قسمیں ہیں۔ وہ یا تو کسی ایک شخص یا چند اشخاص کے ساتھ مخصوص ہونگے اور یا کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص ہونگے خواہ وہ زمانہ قلیل ہو یا کثیر۔ پس جو احکام کسی شخص کے یا زمانہ کے ساتھ مخصوص ہونگے وہ اُس شخص اور زمانہ کے باقی رہنے تک باقی رہینگے۔ احکام میں یہ تغیر و تبدل ہمارے اعتبار سے ہے، ورنہ خدا کے نزدیک سب احکام برابر ہیں[1]

ناسخ و منسوخ کی بحث یہاں ضمناً آگئی ورنہ دراصل اس بحث کے لیے مستقلاً ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ وہ شخص جو فہم قرآن کی سعادت سے بہرہ اندوز ہونا چاہتا ہے اُس کے لیے جس طرح یہ ضروری ہے کہ مفرداتِ قرآن کے معانی کی تعیین کے لیے خود قرآن کی طرف رجوع کرے۔ اسی طرح استنباطِ احکام کے لیے ضروری ہے کہ کسی چیز کے متعلق قرآنِ مجید میں جتنے احکام آئے ہیں، اُن سب کو یکجا کر کے اُن میں باہمی تناسب و توازن پیدا کرنے کی کوشش کرے، اور یہ معلوم کرے کہ کونسا حکم کس زمانہ کے لیے تھا اور کونسا کس زمانہ کے لیے۔ ایک کا مورد و محل کیا ہے اور دوسرے کا کیا؟ ایک کا کیا منشا ہے اور دوسرے سے کیا مراد ہے۔ قرآنِ مجید میں غور کرنے والا اگر احکام متنوعہ کے ان باہمی فروق کو نظر انداز کر کے اُن میں ایک خاص توازن و تناسب پیدا کرنے کی کوشش نہیں کریگا تو قدم قدم پر اُس کو مشکلات پیش آئینگی، اور کہیں وہ "ناسخ و منسوخ" کہہ کر اپنی گلو خلاصی کا سامان کریگا، اور کہیں ایسی رکیک تاویل و توجیہ کریگا جو قرآن کے منشا کے برعکس ہو گی۔

تفسیر و تاویل کا فرق اس موقع پر ضروری ہے کہ تفسیر و تاویل کا فرق بھی معلوم کر لیا جائے۔ تفسیر "فسر" سے

[1] تفسیر عزیزی۔ ص ۳۹۲۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشتق ہے جس کے معنی کھولنے اور بیان کرنے کے ہیں۔ اور "تاویل" کا مادۂ اشتقاق ہے "اول" جس کے معنی لوٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں بعضوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ "ایالت" سے مشتق ہے جس کے معنی سیاست ہیں۔ تاویل کرنیوالا بھی چونکہ کلام کی سیاست سے واقف ہو کر اس کو اپنے موضع و محل میں رکھتا ہے اس لیے اس سائس کلام کو "مؤول" اور اس کے اس فعل کو "تاویل" کہتے ہیں لیکن یہ وجہ ضعیف ہے۔ کما لایخفی علی من لہ بصیرۃ فی مناہج استعمال الالفاظ۔ ابوعبید اور ایک گروہ کا خیال تو یہی ہے کہ تفسیر و تاویل باعتبار معنی ایک ہیں لیکن دراصل یہ صحیح نہیں ہے۔ ابن حبیب نیشاپوری برسبیل طنز کہتے ہیں:-

"ہمارے زمانہ میں ایسے ایسے مفسر پیدا ہوگئے ہیں کہ اگر ان سے تفسیر و تاویل میں فرق دریافت کیا جائے تو وہ اس سے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہیں"۔

امام راغب اصفہانی تفسیر و تاویل میں عام خاص مطلق کی نسبت بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تفسیر کا اطلاق بیشتر الفاظ و مفردات کلام پر ہوتا ہے۔ اور تاویل کا جملوں اور معانی پر۔ اور دوسرا فرق یہ بیان کرتے ہیں کہ تاویل عموماً کتب الٰہیہ میں ہوتی ہے اور تفسیر کتب الٰہیہ و غیر الٰہیہ دونوں میں لیکن ہمارے خیال میں زیادہ دلپسند اور صحیح فرق وہ ہے جو ابو طالب الثعلبی نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تفسیر کے معنی لفظ کی وضع کا بیان کر دینا ہے خواہ وہ حقیقت ہو یا مجاز۔ مثلاً "صراط" کے معنی راستہ "صیب" کے معنی بارش، اور "کفر" کے معنی انکار۔ اور تاویل کہتے ہیں باطن لفظ کی تفسیر کرنے کو۔ گویا تاویل کے معنی ہیں حقیقت مراد کی خبر دینا، اور تفسیر کے معنی ہیں دلیل مراد کی خبر دینا، کیونکہ لفظ کاشف مراد ہونے کے لحاظ سے دلیل مراد ہوتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے ان ربك لبالمرصاد۔ اس کی تفسیر تو یہ ہے کہ "مرصاد" رصد سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں گھات میں رہنا اور نگرانی رکھنا، اس لیے مطلب یہ ہوا کہ تمہارا رب تمہارے اعمال کی دیکھ بھال رکھتا ہے۔ اس کی تاویل یہ ہے کہ ہم کو برے اعمال سے بچنا چاہیے، اور احکام خداوندی کی تعمیل میں تکاسل و تہاون سے کام نہ لینا چاہیے۔ بعض لوگوں نے اس مفہوم کو اس طرح بیان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا ہو کہ قرآن مجید میں جو چیز بیان کی گئی اور صحیح سنّت میں جس کی تعیین کی گئی ہے اس کو ظاہر کر دینا تفسیر ہے کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہو کہ وہ اپنے اجتہاد سو اُن میں کوئی جدت پیدا کرے ورنہ وہ تفسیر بالرائے ہو جائیگی جس کی ممانعت کی گئی ہے۔ اور تاویل اُن احکام کو کہتے ہیں جن کا استنباط علماء کرتے ہیں جو خطاب کے نشیب و فراز سے پوری طرح باخبر ہیں اور جو علوم و فنون میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ علامہ بغوی وغیرہ نے تاویل کی تعریف یہ کی ہے۔

التاویل صرف الآیۃ الی معنی موافق لما قبلہا	تاویل آیت کا لوٹا دینا ہو ایک ایسے معنی کی طرف جو
وما بعدھا تحتملہ الآیۃ غیر مخالف للکتاب	ماقبل اور مابعد کے موافق ہو اور وہ معنی قرآن و سنت
والسنۃ من طریق الاستنباط[1]	کے مخالف نہ ہوں اور ایسے معانی پیدا کرنا از راہ استنباط ہوگا۔

سطور بالا میں تفسیر و تاویل سے متعلق جو اقوال نقل کیے گئے ہیں اُن سو یہ واضح ہوا ہوگا کہ تفسیر کا دار و مدار بڑی حد تک علم لغت، معانی اور ادب پر ہے۔ مگر تاویل یعنی قرآن مجید کی آیت کا صحیح مصداق متعین کرنے کے لیے صرف اُنہی علوم کی ضرورت نہیں بلکہ ضروری ہے کہ تاویل کرنیوالا شریعت کے اسرار و حکم، رموز و غوامض اور اس کے احکام و مسائل سو پوری طرح واقف ہو اور استنباط مسائل کے جو اصول ہیں ان میں مہارت و کمال کا مرتبہ رکھتا ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ شعراء فارس اپنے کلام میں تصوف کے مضامین کثرت سو بیان کرتے ہیں لیکن بقول مرزا غالب کے :-

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ۔۔۔ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یہ شعراء متصوفین شراب بولتے ہیں اور اُس سو شراب معرفت۔ ساقی سو مرشدِ کامل اور شاہد سو شاہد حقیقی مراد لیتے ہیں۔ اس بنا پر جو شخص فارسی شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بعہد ترقی اور شعراء کے اسالیب کلام سو واقف ہوگا اُس کو شاعر کی صحیح مُراد سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئیگی۔ اس کے برخلاف وہ شخص جو ان اسالیب سے واقف نہیں اور صرف زبانِ فارسی جانتا ہو وہ اشعار کا مطلب وہی سمجھیگا جو اُن کے ظاہری و لغوی

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۱۷۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معانی سے مفہوم ہوتا ہے۔ پس اسی طرح دراصل تاویل کا صحیح اہل وہی شخص ہے جو شریعت اسلام کے تمام سرچشموں سے باخبر ہے۔ اس کے بغیر اگر کوئی فہم قرآن کا ادعا کرتا ہے تو اس کا لغزشوں اور ٹھوکروں سے محفوظ رہنا نہایت مشکوک ہے۔ قرآن مجید میں ایک آیت ہے:-

الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولٰئک لھم الامن وھم مھتدون۔ — وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا، انہی کے لیے امن ہے اور وہ سیدھے راستہ پر ہیں۔

اس آیت میں جو لفظ "ظلم" آیا ہے اس سے اگر معنیٰ لغوی مراد لیے جائیں یعنی وضع الشئی فی غیر محلہ تو ہر گناہ صغیرہ و کبیرہ اس کے ماتحت داخل ہو جاتا ہے، اور سوائے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کون ہے جس نے ایک مرتبہ بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہ کیا ہو تو اب اشکال یہ پیش آتا ہے کہ پھر اس آیت کے مصداق کون لوگ ہیں؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ظلم کے معنی لغوی مراد نہیں ہیں۔ اب لامحالہ ظلم کے معنیٰ کی تعیین کرنے کے لیے آپ خود قرآن یا سنت کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ ایک روایت ملتی ہے کہ صحابۂ کرام کی ایک جماعت نے اس آیت کو سن کر سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم نہ کیا ہو، آپ نے فرمایا یہاں ظلم سے مراد "شرک" ہے۔

اس تقریر سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ قرآن مجید کی فہم کا مرحلہ صرف لغت، ادب، اور معانی و بیان کی روشنی میں کسی آیت کے مفہوم سمجھ لینے پر ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی حقیقی مراد و مصداق کو متعین کرنے کے لیے سخت ضرورت ہے کہ فہم قرآن کا طالب شریعت اسلام کے اصل سرچشموں سے کماحقہ واقف ہو، اور ان میں مبصرانہ نگاہ رکھتا ہو۔ اس واقفیت کے بغیر قرآن مجید کو سمجھنے کی سعی کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص امرؤ القیس کے اشعار جاہلیت کی تاریخ، معاشرت، تہذیب و تمدن، روایات، مزعومات و توہمات کو جانے پہچانے بغیر سمجھنا چاہے۔

(باقی)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیمٍ

از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

قرآنِ عزیز نے آیت مسطورہ بالا میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق کریمانہ کی رفعت و بلندی کا تذکرہ کیا ہے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اس لیے کہ ایک انسانِ کامل کا سب سے قیمتی جوہر "اخلاق کاملہ" ہی ہو سکتے ہیں۔ اور ارشاد و ہدایت کی اساس و بنیاد اخلاق حسنہ میں سے "خلق عظیم" ہی پر قائم ہے۔ زبان وحی ترجمان سے خود آپ نے ہی ارشاد فرمایا ہے:۔

انی بعثت لاتمم مکارم الاخلاق	میری بعثت کا مقصد مکارم اور محاسن اخلاق
وفی روایۃ محاسن الاخلاق	کی تکمیل ہے۔
حسن الخلق خلق اللہ الاعظم	حسن خلق اللہ تعالیٰ کے اخلاق میں سب سے
(طبرانی)	بڑا خلق ہے۔

خاتم النبیین کے "خلق عظیم" کے بعض تفصیلی گوشوں کو بھی مختلف آیات میں واضح کیا گیا ہے۔

فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم ولو	(تو اے نبی) یہ اللہ ہی کی رحمت ہے کہ تو اُن کو
کنت فظًّا غلیظ القلب لانفضوا	نرم خو مل گیا اور اگر کہیں تو بدخلق سخت دل ہوتا
من حولک فاعف عنھم ﴿۵۱﴾	تو یہ سب تیرے پاس سے بچھڑ جاتے، تو تو ان کو
	معاف کر دے۔

یعنی خدائے تعالیٰ کا یہ سب سے بڑا احسان ہے کہ اُس نے تم میں ایسا رسول بھیجا جو نرم خوئی اور حسنِ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اخلاق میں اس درجہ بلند اور رفیع مرتبہ رکھتا ہے کہ تمہاری خطاکاریوں، غلطیوں کے باوجود وہ تم پر رحم وکرم ہی کی نگاہ رکھتا، لطف وعنایت سے گفتگو کرتا اور عفو ودرگذر کے ذریعہ تم کو نوازتا ہے ورنہ کہیں وہ تلخ درشت مزاج ہوتا تو تم میں یہ فداکاری، شمع پر پروانہ کی طرح جان نثاری کا جذبہ اُس کے لیے نہ ہوتا، بلکہ تم سب اُس کے پاس سے منتشر ہو جاتے، اور اسلام کی یہ شیرازہ بندی کیسے باقی رہتی، یہ جو کچھ بھی ہے اُس کے حسن خلق ہی کا ثمرہ ہے۔

ورحمۃ للذین اٰمنوا منکم — اور جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں نبی اُنکے حق میں رحمت ہے

آیت خود اپنا مطلب اور وضاحت ہے۔ مومن کے ایمان اور مسلم کے اسلام کی سب سے بڑی قدر وعظمت یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کا آخری پیغمبر، اولین وآخرین کا سردار ایمان والوں کے لیے رحمت ثابت ہو رہا ہے۔ وہ صرف رحیم نہیں ہے بلکہ سراپا رحمت ہے۔ کریم ہی نہیں ہے، از سرتا قدم کرم ہے۔

لقد جاءکم رسول من انفسکم — بے شک تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول آیا

عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم — اُس پر تمہاری تکلیف شاق ہے۔ تم پر (تمہاری

بالمومنین رؤف رحیم۔ (سورۂ توبہ) — بہبودی کے لیے) حریص ہے۔ مومنوں پر شفیق ومہربان ہے۔

ایسا نبی، ایسا رسول جو تمہاری تکالیف پر دلگیر ہو، تمہاری فلاح وبہبود کا ہر وقت حریص وخواہشمند ہو مسلمانوں اور ایمانداروں پر شفیق ومہربان ہو، تم ہی میں پیدا ہوا اور تمہارے ارشاد وہدایت کا سامان کرے تمہارے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا خوش قسمتی، خوش بختی، اور سعادت ہوگی۔

رحمت اس لیے رحمت ہے کہ وہ رحیم ہے اور رافت اسی لیے رافت ہے کہ وہ رؤف ہے۔

فلعلک باخع نفسک علیٰ اٰثارھم — سو اے نبی شاید تو اس غم میں کہ وہ اس بات

ان لم یؤمنوا بھٰذا الحدیث اسفا — (قرآن) پر ایمان نہیں لاتے اُن کے پیچھے جان

کھونے والا ہے (۱۸۵:۶)

© rasailojaraid.com